خطوطِ مودودیؒ ایک تاثراتی مطالعہ

پروفیسر خورشید احمد

زیر نظر تجزیاتی مطالعہ 'پروفیسر خورشید احمد نے "خطوط مودودی": ۲ (مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی 'سلیم منصور خالد' منشورات' لاہور) کے حوالے سے رقم کیا ہے۔ اس طویل تجزیے کی پہلی قسط دی جا رہی ہے (مدیر)۔

اردو ادب کی تاریخ چاہے اپنے سن و سال کے اعتبار سے 'عربی' فارسی اور خود انگریزی جیسی عالمی زبانوں سے کم ہی کیوں نہ ہو' لیکن حقیقت یہ ہے کہ نوعمری کے باوجود اس کا دامن ہر صنف ادب کے بڑے قیمتی اور درخشاں خزانوں سے مالا مال ہے۔ نہ صرف نعت 'حمد 'غزل 'نظم 'گیت ' مثنوی' داستان' ناول' افسانہ' ڈراما' مضمون' مقالہ' انشائیہ' سفرنامہ اور طنز و مزاح' بلکہ مکتوب نگاری کے میدان میں بھی ایک قیمتی اور روشن روایت نظر آتی ہے۔ اردو ادب ایک ایسا مکمل البم ہے ' جس میں فکر و فن کی ہر تصویر اپنے مقام پر موجود ہے۔

انسانی زندگی میں خط کا ایک بڑا ہی منفرد مقام ہے 'جس طرح زبان دوسرے انسانوں سے گفتگو کا ذریعہ ہے' اسی طرح خط اپنوں اور غیروں سے قلمی گفتگو کا وسیلہ ہے۔ ایک طرف یہ انسانی تعلقات استوار اور مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے' دوسری طرف یہ ان تعلقات کی کمیت اور کیفیت کا آئینہ بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بہ یک وقت فکر' جذبات 'احساسات اور شخصیت کے اظہار کا ایک فطری مگر موثر آلہ ہے۔

خطوط کا بڑا حصہ انسانوں کے درمیان درجہ بدرجہ ربط و تعلق 'جذبات و احساسات اور افکار و معاملات کے اظہار کی فطری اور حقیقی ضرورتوں کا پیدا کردہ ہے۔ ان کے ذریعے ذاتی تعلقات 'فکری مباحث 'کاروباری معاملات 'معاشرتی و ثقافتی روابط استوار کیے جاتے ہیں۔ یہ مقصد اور مدعا کے اظہار کا ذریعہ ہیں اور جذبات کی تسکین کا وسیلہ بھی۔ اردو کے خزینہ مکتوبات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زندگی کے تمام ہی پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس آئینے میں خانگی کیفیات ' اور عشق و محبت کے جذبات سے لے کر فلسفیانہ امور' ادبی نکات اور عالمی اور ملکی مسائل سب کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ کچھ خطوط وہ بھی ہیں جو بالکل ذاتی اور خانگی ہیں 'جن کی اصل حیثیت "ذاتی امانت" کی سی

ہے ' اور جو دو افراد کے درمیان سرگوشی سے عبارت ہیں ۔ ان کے لکھنے والے کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ یہ خط شائع ہوں گے اور اس طرح ایک تیسرا شخص بھی اس نجی محفل میں در آئے گا ۔

اسی طرح کچھ خط ایسے بھی ہیں جو لکھے ہی گئے ہیں چھپوانے کے خیال سے ' بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کچھ خطوط مکتوب الیہ کو بھی حسن طباعت سے آراستہ ہونے کے بعد ہی ملے ہیں۱ ۔ پھر ایسے خطوط بھی ہیں جن کا مکتوب الیہ خیالی ہے ۔ ایسے بے نام خطوط کا مقصد کسی متعین شخص سے گفتگو نہیں بلکہ یا وہ خود کلامی کا ایک ذریعہ ہیں یا محض اظہار مدعا کا ایک اسلوب۲ ۔ ادب کا دامن ان خطوط سے بھی خالی نہیں جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

ادب کی کہکشاں میں ان سب کا اپنا مقام ہے ' لیکن جو خطوط مکاتیبی ادب کو فکر و فن دونوں کے اعتبار سے ایک قیمتی سرمایہ بناتے ہیں ' وہ ہیں جن میں سوز دل اور غم جاناں کے ساتھ مسائل حیات اور غم روزگار سے بھرپور تعرض کیا گیا ہے ۔ یہ مکاتیب فکری مسائل ' نظریاتی مباحث اور قومی و اجتماعی معاملات کی تفہیم کا مرقع ہیں ' اور یہی ان کی منفرد شان ہے ۔ اگر مکاتیب کا یہ خزانہ اردو ادب کا حصہ نہ ہوتا تو دنیائے علم و ادب اپنی غربت کا نوحہ کرتی اور آنے والی نسلیں اپنے تہذیبی اور سیاسی ورثے کے بڑے قیمتی حصے سے محروم ہو جاتیں ۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب (ف ۱۸۶۹) جس طرح اردو غزل کے امام ہیں اور ان کا دیوان ایک تاریخ ادب اردو میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ شاعری کی طرح غالب کے خطوط بھی مکتوب نگاری کے باب میں ایک نئے دور کے باب کشا ہیں ۔ دیوان غالب مرتب اور محفوظ نہ ہوتا جب بھی غالب کے خطوط ان کے مقام رفیع کی ضمانت کے لیے کافی تھے ۔ کہا جا سکتا ہے غالب نے اردو ادب کو جن بلندیوں اور وسعتوں سے ہم کنار کیا ' اس میں ان کے کلام کے ساتھ ان کے مکاتیب کا بھی نمایاں حصہ ہے ' اور خود کلام غالب کی شرح و توضیح میں بھی ان خطوں کا ایک اہم رول ہے ۔ غالب کے بعد خطوط نگاری کی جس روایت پر ہم گفتگو کر رہے ہیں ' اس کی آبیاری اور تزئین میں جن اہل علم و ادب نے نمایاں حصہ لیا ' ان میں سرسید احمد خاں ' الطاف حسین حالی ' شبلی نعمانی ' ابوالکلام آزاد ' علامہ محمد اقبال ' مولوی عبدالحق ' مہدی افادی ' سید سلیمان ندوی ' عبدالماجد دریابادی ' نیاز فتح پوری ' فراق گورکھپوری ' رشید احمد صدیقی ' مولانا حسین احمد مدنی ' خواجہ حسن نظامی وغیرہم قابل ذکر ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک کا ' گیسوئے اردو سنوارنے اور آبروئے علم و فن کو چار چاند لگانے میں اپنا اپنا حصہ ہے ' مگر مکتوباتی ادب میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹) کے خطوط کی ایک منفرد شان ہے ۔ علم و

ادب کی اس کہکشاں میں وہ سب کے ساتھ بھی ہیں اور سب سے الگ بھی ؎

آفاق ہا گر دیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے بعد ہوتا ہے اور یہ آفتاب علم و ادب ۱۹۷۹ تک ضوفشانی کرتا رہا۔ تقریباً ساٹھ سال پر محیط اس عرصے میں سید مودودی نے ہزاروں افراد سے اور ہزارہا موضوعات پر قلمی گفتگو کی ہے۔ اس میں اہل خانہ، قریبی دوست و احباب، تحریکی ساتھی، سیاسی ناقد، مشاہیر علم و ادب اور گم نام سائل، سب ہی سے ان کا قلمی ربط رہا ہے۔ ان کے خطوط کی تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے، لیکن غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ ان کے مکتوبات کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار کے درمیان ہوگی۔ یہ ایک سانحہ ہے کہ اس قیمتی خزانے کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا یا دستیاب نہیں۔ اب تک جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان میں خالص علمی اور تحریکی امور سے متعلق خطوط کی پانچ جلدیں "رسائل و مسائل" کے نام سے آ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا مودودی کے خطوط کے آٹھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان ۱۳ جلدوں میں کئی ہزار خطوط شامل ہیں اور ابھی ہزاروں کی تعداد میں قیمتی موتی اور جواہرپارے گوشہ خمول میں ہیں جن کی تلاش، ترتیب اور طباعت ان کے معنوی فرزندوں پر قرض ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ برادران عزیز ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور سلیم منصور خالد نے ان جواہر کو جمع کرنے اور اہلِ علم و ادب تک ان کو پہنچانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ۱۹۸۳ میں "خطوط مودودی" کی پہلی جلد ان کی مساعی کے نتیجے میں سامنے آئی، جس میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام مولانا مودودی کے بڑے قیمتی اور تحریکی اعتبار سے بے حد اہم خطوط شائع کیے گئے۔ اب ۱۹۹۵ میں خطوط مودودی کی دوسری جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہے۔ اس مجموعے میں مولانا محترم کے ایک سو پچاس خط ہیں، جو ۱۹۲۰ سے لے کر ۱۹۷۹ کے عرصے میں لکھے گئے۔ ان خطوط کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ بڑی محنت اور عرق ریزی سے ہر خط کا ابتدائیہ اور حواشی لکھے گئے ہیں، جن کے ذریعے وہ تمام معلومات فراہم کی گئی ہیں، جو قاری کو ان تمام نکات اور اشاروں اور کنایوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں جو خطوط میں مضمر ہیں۔ ان معلوماتی اضافوں میں اس پس منظر اور ماحول کو نمایاں کیا گیا ہے جس میں خط لکھا گیا، اور ان ماخذ کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں سے مزید معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس عظیم ادارتی خدمت نے اس مجموعے کی اہمیت اور افادیت میں بڑا اضافہ کیا ہے اور اس کو باقی تمام مجموعوں سے واضح طور پر منفرد کر دیا ہے [۳]۔

مولانا مودودی کے خطوط مقصدی مکتوب نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ ان خطوں میں ان کے

ذاتی تعلق، گھریلو حالات اور قلبی کیفیات کا ذکر بھی آتا ہے، لیکن بہ تقاضائے فطرت اور بہ قدر ضرورت۔ بلاشبہ مضمون اور خط کا اصل فرق ہی خط کے ذاتی رنگ اور واحد متکلم کی کیفیت میں ہے۔ خط میں جذبات و احساسات کی آویزش تحریر کو اس کا اصل آہنگ دیتی ہے، ورنہ اگر خط میں صرف مضمون اور مقالے کی فضا ہو تو وہ خط نہیں کچھ اور ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہو گا کہ اگرچہ مصنوعی خط نگاری بھی شخصیت کا ایک مظہر ہے، لیکن یہ اعجاز ایک عام اور سیدھے سادے خط ہی کا ہے کہ وہ مکتوب نگار کی شخصیت کا ایک بے لاگ آئینہ ہوتا ہے۔ اس میں لکھنے والے کے خیالات اور علم و ادب ہی کا پرتو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ وہ اس کی شخصیت اور مزاج کے بہت سے پہلوؤں کا عکاس ہوتا ہے۔ اس کسوٹی پر مولانا کے خطوط پارس نظر آتے ہیں۔

مولانا مودودی کی زندگی کے ہمہ جہت، مسائل، مصائب، کشمکش اور بہت سے دوسرے پہلو خطوط کے اس آئینے میں صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان خطوط میں ذاتی جذبات اور احساسات کی حرارت کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہزاروں مسائل پر سوچی سمجھی آرا کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان میں بیماریوں کا ذکر ہے، حکیم ڈاکٹر سے مشوروں کی بات ہے، دوستوں سے شکوہ شکایت بھی موجود ہے، عدیم الفرصتی کا نوحہ ہے، ملت کی زبوں حالی کا تذکرہ ہے، مستقبل کے عزائم کا اظہار ہے، سوز دروں اور روح کی بے چینی کی جھلکیاں ہیں، دین اور سیاست پر گفتگو ہے، فلسفہ اور ادب پر اظہار خیال ہے، تحریکی مسائل پر بحث ہے، معترضین سے مجادلہ و مکالمہ ہے، ارباب اقتدار کا احتساب ہے اور وقت کے اہم مسائل پر سادگی اور صفائی کے ساتھ نقد و تبصرہ ہے۔ تحریر میں بلا کی روانی اور جملے جملے میں ادبی حسن ہے۔ کہیں بھی مصنوعی طور پر بیان میں رنگینی اور ادبی چاشنی پیدا کرنے کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے مکتوب میں ہر جگہ سادگی اور صفائی لیکن پورے اعتماد اور قدرت کے ساتھ اپنی بات کو واضح کرتے ہیں، اور حشو و زوائد سے کلی اجتناب کرتے ہیں۔ مکتوب نگار کی دلچسپی اظہار مدعا سے ہے، محض ادب طرازی سے نہیں۔ طرز بیان میں سادگی، بے تکلفی اور برجستگی بدرجہ اتم ہے۔ زبان و بیان میں صحت اور حسن عبارت کا پورا اہتمام ہے، لیکن لفاظی اور قافیہ آرائی سے مکمل احتراز۔

مولانا مودودی کے اسلوب کا ایک اہم پہلو یہ نظر آتا ہے کہ وہ بس ضرورت کے تحت خط لکھتے ہیں۔ خط ضرورت ہی کے مطابق مختصر یا طویل ہوتا ہے، اور اصل ہدف بس یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مدعا کو صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیں، مگر اس انداز میں کہ بات پڑھنے کے قابل ہو اور پڑھنے والے کے لیے دلچسپ و دل نشیں۔ ان کی تحریر کی یہ خوبی ہے کہ نہ لکھنے والے کو یہ شکایت ہوتی ہے اور نہ پڑھنے والے کو کہ "مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا"۔ یہ چیز مولانا مودودی کے خطوط کو نامور دینی عالموں، مشاہیر اور مبلغین کے خطوط سے ممیز و ممتاز کرتی ہے۔ ان کا اسلوب جدید اور ان کی زبان

سادہ اور سلیس ہے، ان کی عبارت صحتِ بیان کے ساتھ ساتھ ادبی حسن اور برجستگی سے آراستہ اور پراثر ہے۔ انداز بیان منطقی اور مدلل ہے۔ بات دل اور دماغ دونوں کو اپیل کرتی ہے۔ کہیں کہیں ان کے قلم کی شوخی، ظرافت و بذلہ سنجی (wit) کا ایسا نمونہ دکھلاتی ہے کہ قاری دیر تک لطف لیتا رہتا ہے۔ غرض مولانا مودودی کے خطوط ان کی بوقلموں شخصیت کا آئینہ اور ان کے افکار اور احساسات کے سچے ترجمان ہیں۔

ان خطوط کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ مکتوب نگار کا فکر و فن ان کی ہر سطر میں بوئے گل کی طرح موجود ہے اور مخفی بھی۔ مولانا کے خط ان کی شخصیت کے گرد گردش نہیں کرتے اور نہ شخصیت کو ابھارنے اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان پر اسلام، دعوت اسلامی، تحریک اسلامی اور ملت اسلامیہ کا رنگ غالب ہے۔ موجودہ مجموعے میں برعظیم پاک و ہند میں اسلامی دعوت اور ملت اسلامیہ کی تاریخ کے نشیب و فراز کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے، اور اس جدوجہد کا عکس بھی جو دور حاضر کے چیلنجوں کے مقابلے کے لیے اسلام کے خادموں نے کی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی وجہ سے خطوط مودودی کا موجودہ مرقع اگر ایک طرف سید مودودی کی شخصیت اور ان کے مشن کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں، تو دوسری طرف عصر حاضر میں اسلامی تحریک اور اس کی جدوجہد کی بہتر تفہیم کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ ان خطوں کے مطالعہ سے اسلام کے پیغام کی عظمت دل و دماغ پر مرتسم ہوتی ہے اور لکھنے والے کے لیے دل میں احساس ممنونیت پیدا ہوتا ہے۔ وقت کے مسائل پر مولانا کی گرفت اور دنیا کے اصول و اقدار پر ان کے اعتماد کا نقش دل پر اور گہرا ہو جاتا ہے۔

ان خطوط کے مطالعے سے مولانا مودودی کی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ محض ایک فلسفی، مفکر، متکلم یا سیاست دان کی نہیں، بلکہ باعمل عالم اور ایک داعی الی الخیر کی تصویر ہے، جو دنیا کی ہر چیز کو اپنے مقصد پر قربان کر دینا چاہتا ہے۔ جو انسانیت کی زبوں حالی پر متفکر اور مسلمانوں کی تہی دامانی پر مغموم ہے۔ جو اسلام کے عالمی کردار پر پختہ یقین رکھتا ہے، اور اس کی روشنی میں ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے لیے جسم و جاں کی بازی لگانے کے لیے سرگرم ہے، جو غفلت میں گم امت مسلمہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہا ہے، جو راہ حق کے لیے ساتھیوں کا متلاشی ہے اور ہر طالب خیر کو اس جدوجہد میں شریک کرنے کے لیے بے چین ہے۔ آپ ان خطوں میں یہ سارے مناظر دیکھ سکتے ہیں۔ دوران مطالعہ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اس راہ دعوت و عزیمت کے ہر موڑ، ہر مرحلے، ہر مشکل اور ہر آزمائش کے بارے میں سید مودودی کے تاثرات کیا ہیں؟ اور کس طرح وہ خود بھی ان آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ سب سعید روحیں ہماری زندگانی کے اس کارزار میں شریک ہو جائیں۔

ایک دل ہے اور طوفان حوادث لے جگر ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

اوپر کے صفحات میں مولانا کے خطوط کی خصوصیات کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے، آیئے اب اس مجموعے کے خطوط سے ان کی کچھ مثالیں دیکھیں، تاکہ دعوے کا ثبوت بھی آپ کے سامنے آسکے۔۔۔ سب سے پہلے چند جھلکیاں مکتوب نگار کی شخصیت کی دیکھ لیجیے:

شخصیت و کردار کا حسن

مولانا مرحوم کے بارے میں بہت سے حضرات کا خیال ہے کہ وہ غیر جذباتی اور ذاتی تعلقات کے سلسلے میں سرد مزاج تھے، لیکن ان کی شخصیت کی بارے میں یہ بڑا ہی سطحی اندازہ ہے۔ جو افراد ان کے قریب رہے ہیں، وہ گواہی دیں گے کہ غیر جذباتی طبیعت کا یہ تاثر، ان کی مضبوط قوت ارادی کی وجہ سے بنتا تھا، جو جذبات کے مدوجزر کو لگام دیے رکھتی تھی۔ ورنہ وہ جذبات سے بھرپور دل اور اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق اور مجسم رحمت و محبت تھے۔ ذاتی تعلقات کو درجہ بہ درجہ نبھانا انھی کا حصہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جماعت اسلامی پر پابندی (جنوری ۱۹۶۴) عائد ہونے کے بعد، مارچ میں لاہور سنٹرل جیل میں جماعت کی مجلس شوریٰ کے تمام ارکان جمع کیے گئے تھے، رات کو بارش کی جھڑی لگی اور ہم میں سے بیشتر افراد باہر خیموں میں تھے، تو مولانا نے ساری رات بے چینی میں ٹہل کر گزاری اور ایک ایک ساتھی کے لیے متفکر رہے۔ ہم میں سے جو بیمار ہوئے ان کی تیمارداری خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ ان خطوط میں بھی جگہ جگہ مولانا کی باطنی کیفیات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک طرف فطری انسانی جذبات کا وفور ہے تو دوسری طرف مضبوط قوت ارادی کے ذریعہ ان کا ضبط، سید مودودی کے کردار کا یہ حسن، حیدر آباد، دکن سے ہجرت کرتے وقت چودھری نیاز علی خاں کے نام ایک خط میں چھلک پڑتا ہے:

"اب مجھے محسوس ہونا شروع ہوا ہے کہ ہجرت کیسی سخت چیز ہے۔ باوجودیکہ حیدر آباد میرا وطن نہیں ہے اور میں یہاں سے کسی مصیبت اور بے سروسامانی کی حالت میں نہیں نکل رہا ہوں، مگر پھر بھی ایک عجیب قسم کی تکلیف اپنے قلب میں محسوس کر رہا ہوں۔ جس مکان میں برسوں رہا ہوں، جن چیزوں کو شوق سے خریدا اور بنوایا تھا، وہ سب ہر وقت سامنے کھڑی فریاد کرتی رہتی ہیں کہ تو ہمیں کہاں چھوڑے جا رہا ہے۔ اگرچہ اپنی قوت ارادی سے کام لے کر اس کیفیت کو دبا رہا ہوں، مگر فطری جذبات تو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتے"۔ (خطوط مودودی ج ۲، ص ۱۴۱ - ۱۴۳)

پروفیسر فروغ احمد، جماعت کے پرانے کارکن اور قریبی ساتھی تھے۔ جب بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) سے ان کی خیریت کی پہلی اطلاع آتی ہے، مولانا کے جذبات پھوٹ پڑتے ہیں، لکھتے ہیں:

"معلوم کر کے کہ آپ بخیریت ہیں، اتنی خوشی ہوئی کہ عید کی خوشی بھی اس کے مقابلے میں کم ہی ہوگی۔ جو رفقا وہاں رہ گئے ہیں، خصوصاً غیر بنگالی رفقا، ان کے متعلق ہمیں تو ایک طرح سے مایوسی ہو چکی تھی کہ اب کبھی اس زندگی میں ان سے ملنا ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ ایک ایک آدمی کا خیال آتا ہے اور سوچتا ہوں کہ نہ معلوم وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ اللہ کا سراسر احسان ہے کہ آپ اس جہنم زار میں بخیر ہیں۔ وہاں سے آپ کے نکلنے کی جو صورت بھی ممکن ہو، وہ ہمیں بتائیں۔ لندن میں ایسے ہمدرد موجود ہیں، جو اس کام میں ہر طرح کی مالی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہاں سے یہاں براہ راست آنے کی بہ نسبت لندن جا کر آنا زیادہ آسان ہے"۔ (ایضا، ص ۴۹۷-۴۹۹)

نذیر احمد قریشی، مولانا محترم کے نہایت قریبی اور بے تکلف دوست تھے، ان کے نام خط سے اپنے کام کی وہ لگن جھلکتی ہے جو ان کی قوت ارادی کا منبع تھی، اور اظہار جذبات کی فرصت دینے میں بھی مانع:

"خط ماشاء اللہ خاصا طویل ہے، تاہم میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا، اور دوسری نشست کو آپ کے لیے وقف کرتا ہوں۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ دوسرا، جواب سے "گریز" کرتا ہے۔ پھر بھی خط لکھنا اور جواب کی پروا کیے بغیر لکھنے پر تلے رہنا، اخلاقی "کمزوری" نہیں بلکہ بڑی زور آوری ہے، جس کو اصطلاح و محاورہ میں "ہیکڑی" بھی کہتے ہیں، مگر آپ یقین کیجیے کہ میں جواب دینے سے "گریز" نہیں کرتا، بلکہ جواب دینے کی فرصت مجھ سے گریز کرتی ہے۔ اگر خدا مجھے عمر نوح عطا کرتا تو یقیناً میں ایک صدی تو ضرور دوستوں سے لطف گفت و شنید حاصل کرنے میں گزار دیتا۔ مگر یہاں تو حد سے حد چھلانگ ماری تو ۶۰ سے آگے جانے کی امید نہیں ہے۔ اس لیے کام کرنے کی ہوس بڑھی ہوئی ہے اور بڑھتی جا رہی ہے اور اس کی بدولت اتنے جھنجٹ جان کو لگ گے ہیں کہ اللہ ہی ان سے عہدہ برآ کر سکتا ہے"۔ (ایضا، ص ۳۰-۳۱)

اپنی والدہ سے والہانہ محبت کے تعلق اور ان کے ملکوتی حسن کردار کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں کہ اس آئینے میں خود ان کی شخصیت بھی جھلک رہی ہے:

"آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کی فرمایش نے میرے دل کے اس زخم کو پھر تازہ کر دیا جو اپنی والدہ ماجدہ مرحومہ کی وفات سے اس کو لگا تھا۔ اگرچہ اب ان کو دنیا سے رخصت ہوئے کئی سال ہو گئے، مگر جب کبھی ان کا ذکر آجاتا ہے دل تڑپ اٹھتا ہے۔ ان کی خوبیاں ایسی تھیں کہ ان کی اپنی اولاد تو کجا، ان کے دور دراز کے رشتہ دار اور ان سے ملنے والی خواتین تک ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ نہایت ملنسار، ہر ایک سے محبت کے ساتھ ملنے والی، ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ---- اپنے عزیزوں کے سوا ان گنت خواتین ہیں جن کو انھوں نے بہن یا بیٹی بنا رکھا تھا اور ان سے رشتہ داروں ہی

کا سا سلوک فرماتی تھیں۔ فیاضی کا یہ حال کہ پیسہ ان کو گویا کاٹتا تھا۔ جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا' حاجت مندوں کی مدد اور مہمانوں کی تواضع پر خرچ کر کے خالی ہاتھ رہ جاتی تھیں۔ زندگی بالکل فقیرانہ تھی۔ موٹا جھوٹا اور پیوند لگا ہوا لباس رغبت سے پہنتی تھیں اور جو نیا لباس ان کے لیے بنایا جاتا اسے کسی نہ کسی کو عطا کر دیتی تھیں۔ کھانے پینے میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ اچھے سے اچھا دوسروں کو کھلاتیں اور برے سے برا خود کھاتیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ گھر والوں اور باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو کھانا کھلانے کے بعد خود پتیلی پونچھ کر روٹی کھایا کرتی تھیں۔ خاکساری کا یہ حال تھا کہ غریب سے غریب لوگوں کو بہن اور بیٹی بنا کر انھی کے ساتھ بیٹھا کرتیں اور امیروں کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتیں۔ محلہ کی غریب عورتیں ہر وقت ان کو گھیرے رہتیں۔ قرآن پڑھانے کا بے حد شوق تھا' جہاں رہتیں آس پاس کی بچیوں کو جمع کر لیتیں اور انھیں قرآن پڑھاتی رہتیں۔ نہایت زاہد و عابد' ذاکر و شاغل تھیں' لیکن کبھی انھوں نے نہ زہد و تقویٰ کا لوگوں کے سامنے مظاہرہ کیا' نہ اس پر فخر کا ادنیٰ شائبہ تک ان کی زندگی میں کبھی پایا گیا۔ میرے ساتھ بے انتہا محبت کرتی تھیں' مگر بچپن سے انھوں نے یہ طرز عمل رکھا کہ کوئی بری بات یا کوئی غلط کام کرتے دیکھتیں تو فوراً تنبیہہ کرتیں اور بے جا محبت سے اولاد کو بگاڑنا ان کو اتنا ناپسند تھا کہ دوستوں کو بھی بے جا لاڈ پیار کرتے دیکھ کر اس سے منع کرتی تھیں۔ میرے بس میں نہیں ہے کہ ان کی تعریف کا حق ادا کر سکوں۔ ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ جس محبت سے انھوں نے مجھے پالا اور جس تربیت سے انھوں نے میری زندگی کو سنوارا' اس پر اللہ تعالیٰ انھیں بے حد و حساب اجر عطا فرمائے"۔ (ایضاً' ص ۵۱۵-۵۱۶)

ایسی ماؤں کا وجود اسلام کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ سید مودودی جیسے انسان ایسی ہی ماؤں کی تربیت کا حاصل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کی فطرت میں خیر رکھا ہے' لیکن اسلام نے اس خیر کو جلا بخشی اور ماں کی گود اور اس کی پرورش کے ذریعے ایمان' اخلاق' تہذیب اور کردار کو پروان چڑھانے کے باب میں وہ کارنامہ سرانجام دیا جس کی نظیر کسی دوسری تہذیب و ثقافت میں نہیں ملتی۔ آج اسلام دشمن قوتوں کا سب سے اہم ہدف ماں کی اس گود سے نئی نسلوں کو محروم کر دینا ہے اور اس شیرِ مادر کو مسموم کر دینا ہے جو ایمان اور تہذیب کی غذا رہا ہے۔

اپنی ہم عصر محترم شخصیات کے ساتھ سید مودودی نے جس طرح' بعض اوقات اختلاف رائے کے باوجود' اکرام و مدارات' احترام و یگانگت اور اعتراف و انصاف کے تعلقات رکھے' یہ چیز ان کی شخصیت کا ایک اور حسین پہلو ہے۔

برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی آزادی اور قیام پاکستان کے لیے قائداعظم کی بے لوث خدمات ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ قائداعظم کے بارے میں مدیر نوائے وقت مجید نظامی

کے نام اپنے ایک خط میں مولانا مودودی اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

"آپ کی معلومات کے لیے اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی، میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا، ان میں ایک قائداعظم مرحوم بھی تھے، میں نے ہمیشہ ان کو ایک بااصول، راست باز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا اور ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۸ تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔ قائداعظم مرحوم کے متعلق مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے، البتہ ان کے "پس ماندگان" کے متعلق مجھے یہ شبہ ضرور ہے کہ وہ ان کی ہم نوائی میں مخلص نہ تھے اور یہ شبہ ان حضرات کے ان اعمال کی بنا پر ہے جو اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ کرتے رہے"۔ (ایضاً، ص ۴۴۳)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سے سید مودودیؒ کے قریبی تعلقات تھے اور مولانا موصوف بھی سید مودودی پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ سید مودودی نے برعظیم کے تمام چوٹی کے علما کو تحریک اسلامی میں شرکت اور اس کی راہ نمائی کی دعوت دی۔ جواب میں نحن انصار اللہ کی جگہ اعتراضات اور طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہوگئی۔ مولانا گیلانی نے بھی اس پس منظر میں کچھ اپنے اور زیادہ دوسروں کے جذبات و احساسات کا اظہار فرمایا تو نوجوان داعی کا پیمانہ صبر کچھ چھلک سا گیا، بے چین ہو کر لکھتے ہیں:

"میں اپنے ان الفاظ پر بہ ادب معافی چاہتا ہوں جو میں نے پچھلے عریضہ میں لکھے تھے۔ اللہ علیم ہے کہ میری نیت ہرگز تحقیر کی نہ تھی۔ میں اس قسم کی باتیں صرف تحریض کی نیت سے لکھا کرتا ہوں۔ جو جذبہ مجھے کبھی کبھی حد ادب سے آگے بڑھا لے جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ جیسے صاحب بصیرت اور صاحب دل حضرات کو میری آنکھیں مقدمتہ الجیش میں بلکہ اس سے بھی آگے دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ کام جسے مجھ جیسے ایک کم مایہ آدمی نے سنبھالا ہے، آپ جیسے لوگوں کے کرنے کا تھا اور میرا کام یہ تھا کہ میں آپ لوگوں کی رکاب تھام کر چلتا۔ خدا کی قسم، میرے دل میں نہ کبھی اس بات پر فخر پیدا ہوا کہ میں نے اس کام کو سنبھالا ہے، اور نہ کبھی یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں اس کی سربراہی کا اہل ہوں۔ مجھے تو ہمیشہ اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ یہ جن کے کرنے کا کام تھا، وہ اپنے مرتبے سے فروتر کاموں میں مشغول ہیں اور مجھے اپنی فرومایگی کے باوجود اس کارخطیر کی ذمہ داری اٹھانی پڑی ہے۔ یہی چیز جب مجھے اندر سے کاٹتی ہے تو میں بزرگوں کی شان میں اس قسم کی باتیں کہہ کر گزرتا ہوں جن کی آپ نے شکایت فرمائی ہے۔ لوگ گمان کرتے ہیں کہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا ہوں اور بزرگوں کے منہ آتا ہوں، حالانکہ دراصل میں اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھتا ہوں اور جب بڑوں کی خالی چھوڑی ہوئی جگہ پر

مجبوراً مجھے کھڑا ہونا پڑتا ہے تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور کبھی کبھی جلے دل سے تلخ باتیں کہہ جاتا ہوں کہ ایک چھوٹے کا طعنہ سن کر ہی وہ کسی طرح اپنے اصل مقام پر آکر کھڑے تو ہوں"۔ (ایضاً‘ ص ۲۷۹-۲۸۰)

علامہ اقبال وہ شخصیت ہیں‘ جن سے مولانا کا صرف علمی اور ذہنی تعلق ہی نہیں‘ بلکہ بڑا گہرا جذباتی اور تحریکی تعلق بھی نمایاں ہوکر ابھرتا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ۲۰ویں صدی میں جن افراد نے اسلامی فکر اور احیائے اسلام کی عملی تحریک کی اپنے خون جگر سے آبیاری کی ہے‘ان میں علامہ اقبال اور سید مودودی کا حصہ سب سے نمایاں ہے۔ وہ خط علامہ اقبال کی وفات پر مولانا کے جذبات اور احساسات کا مرقع ہے‘ جو انھوں نے نذیر نیازی صاحب کو لکھا:

"میں اپنے وعدے کے مطابق آنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ یکایک علامہ کے انتقال کی خبر پہنچی۔ دفعتہ دل بیٹھ گیا۔ سب سے زیادہ رنج مجھے اس بنا پر ہوا کہ کتنا قیمتی موقع میں نے کھو دیا۔ آپ کے عنایت نامے سے مجھے صحیح اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وقت اس قدر قریب آگیا ہے۔ اگر معلوم ہوتا تو سب کام چھوڑ کر فوراً پہنچتا۔ میں اس کو اپنی انتہائی بدنصیبی سمجھتا ہوں کہ اس شخص کی آخری زیارت سے محروم رہ گیا‘جس کا مثل شاید اب ہماری آنکھیں نہ دیکھ سکیں گی۔

محمد علی [جوہر] کے بعد یہ دوسرا نقصان عظیم مسلمانوں کو پہنچا ہے‘ اور یہ نقصان میری نگاہ میں پہلے نقصان سے عظیم تر ہے۔ کچھ خبر نہیں کہ اللہ کو کیا منظور ہے۔ بظاہر تو ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ مسلمان قوم کو اس کی ناقدری و نااہلی کی سزا دی جارہی ہے کہ اس کے بہترین آدمی عین اس وقت پر اٹھالیے جاتے ہیں جب ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اب سارے ہندوستان پر نگاہ ڈالتا ہوں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی طرف ہدایت حاصل کرنے کے لیے رجوع کیا جا سکے۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ ایک شمع جو ٹمٹا رہی تھی وہ بھی اٹھالی گئی۔

مجھے جو چیز پنجاب کھینچ کر لائی تھی وہ دراصل اقبال ہی کی ذات تھی۔ میں اس خیال سے یہاں آیا تھا کہ ان سے قریب رہ کر ہدایت حاصل کروں گا‘ اور ان کی رہنمائی میں جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا اسلام اور مسلمانوں کے لیے کروں گا۔ اب میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ اس طوفانی سمندر میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ دل شکستگی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی ہے۔ صرف اس خیال سے اپنے دل کو ڈھارس دے رہا ہوں کہ اقبال مرگئے تو کیا ہوا‘ خدا تو موجود ہے۔ سب مرجانے والے ہیں‘ زندہ رہنے والا وہی حی وقیوم ہے۔ اور اگر وہ تجھ سے کوئی کام لینا چاہے گا تو تیری مدد کے لیے اور کچھ سامان کرے گا

برادرم‘ آپ آخر وقت تک علامہ کے ساتھ رہے ہیں۔ اگر میری ہدایت کے لیے انھوں نے کچھ فرمایا ہو تو مجھے ضرور اس سے مطلع کریں"۔ (ایضاً‘ ص ۱۸۹-۱۹۱)

لیکن مولانا کے گہرے قلبی تعلق کا اظہار اس ایک جملہ میں ہوتا ہے، جو اس خط میں مابعد تحریر کرتے ہیں:

"میں چاہتا ہوں کہ ان کے پسماندگان کو تعزیت کا خط لکھوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ ان کے پسماندے تو ہم سب ہیں، اور ہم سب تعزیت کے مستحق ہیں"۔ (ایضاً، ص ۱۹۱)

اس ایک جملے میں قرب اور یگانگت کے جس سمندر کو بند کر دیا گیا ہے، وہ مولانا ہی کا حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی ان کا سہارا تھا، اور اس کے ساتھ انھیں عبدیت، فقر و احتیاج، اور صبر و استغفار کا جو گہرا تعلق تھا، اس کی ایک جھلک دیکھیے۔ ترغیب اور تحریص کے بعد مولانا مناظر احسن گیلانی کے سامنے خود اپنا کلیجہ چیر کر رکھتے ہیں، لکھتے ہیں:

"آپ کا یہ شبہ کہ میں ابتلا و امتحان کے میدان میں دعوے کے ساتھ اتر رہا ہوں، میری قلبی حالت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں لرزتے اور کانپتے ہوئے اس میدان میں قدم رکھ رہا ہوں۔ اپنی قوت پر نظر ڈالتا ہوں تو وہ اتنی کم نظر آتی ہے کہ مجھے ہر وقت گر جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر جب یہ یاد آتا ہے کہ اس مختصر سے عرصہ حیات میں کتنے گناہ کر چکا ہوں، کتنا زمانہ نافرمانیوں میں گزارا ہے، اللہ کی دی ہوئی کتنی قوتیں محض اپنے نفس کی خوشی پوری کرنے میں صرف کر ڈالی ہیں، اور اب بھی تقویٰ اور عبودیت کا کتنا حقیر سرمایہ میرے پاس ہے، تو مجھے اپنی نجات کی کوئی صورت اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ کوئی چوٹ خدا کی راہ میں کھاؤں اور اسی چوٹ کا داغ لیے ہوئے مالک کے دربار میں حاضر ہوں، تاکہ شاید اسی کو دیکھ کر کچھ نظر عنایت ادھر مائل ہو جائے۔ میری حالت اس مریل گھوڑے کی سی ہے جس میں بل بوتا کچھ نہیں ہی، مگر پیچھے سخت کوڑا پیٹھ پر پڑنے کا خطرہ جو اسے لگا ہوا ہے، وہ اس کو ایک پُرخطر راستے پر بھاگ کر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ آپ کو میرے جرات آمیز الفاظ سے یہ گمان گزرتا ہو گا کہ میں اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں، حالانکہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ بڑے مراتب تو درکنار اگر صرف سزا سے بچ جاؤں تو یہ بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے۔ البتہ میں اپنی اس قلبی کیفیت کا کوئی اثر اپنی تحریروں میں نہیں آنے دیتا اور قصداً جرات آمیز زبان استعمال کرتا ہوں کیونکہ اس کام کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کے لیے ڈھیلی اور کمزور زبان موزوں نہیں ہو سکتی"۔ (ایضاً، ص ۲۸۰-۲۸۱)

چودھری نیاز علی خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خدا سے دعا فرمایئے کہ کامیابی کی توفیق بخشی جائے۔ میں کوئی قوت نہیں رکھتا۔ تنہا اپنی طاقت سے ایک ایسی گری ہوئی قوم کو سنبھالنے کا خیال کروں تو مجھ سے زیادہ بے عقل کوئی نہ ہو گا۔ مجھے

امید جو کچھ بھی ہے صرف یہ ہے کہ اگر میں نے خلوص نیت اور بے غرضی اور للہیت کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت کی تو اللہ کی طاقت میرے ساتھ ہوگی اور اسی کی طاقت اصلی طاقت ہے۔لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ"۔(ایضاً، ص ۱۰۷)

اپنے ایک نہایت عزیز ساتھی چودھری نذیر احمد کی اہلیہ محترمہ کو چودھری صاحب کی بیماری کی شدت اختیار کرنے پر لکھتے ہیں:

"یہ تو اطمینان ہے کہ علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی ہوگی۔آپ کے صاحبزادے خود ڈاکٹر ہیں اور یہاں اچھے سے اچھے ڈاکٹروں سے علاج کروا سکتے ہیں۔لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرنی چاہیے، کیونکہ اصل شفا دینے والا وہی ہے اور اسی کی توفیق سے ڈاکٹر اور دوائیں نفع پہنچاتی ہیں۔میں خود بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے نہایت قیمتی رفیق کو جلدی سے مکمل شفا عطا فرمائے، تا کہ وہ اس کے دین کی خدمت کر سکیں۔آپ بھی اکثر یہ دعا مانگا کریں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی ہے:

اذھب الباس رب الناس ، انت الشافی لاشفاء الاشفاوک شفاء لایغادر سقما"

اس کے علاوہ رات کو سوتے وقت قُلْ ھُوَ اللّٰہ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس تین دفعہ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکیں اور پھر ان کو چودھری صاحب کے سارے جسم پر ملیں، بلکہ اگر چودھری صاحب ہوش میں ہوں تو ان کے ہاتھوں پر پھونکیں اور وہ خود اپنے ہاتھ اپنے سارے جسم پر ملیں۔یہ رسول اللہؐ کا اپنا طریقہ تھا اور آپؐ کی آخری بیماری میں حضرت عائشہؓ کبھی اپنے ہاتھوں پر پھونکتیں اور حضورؐ کے جسم مبارک پر انھیں ملتی تھیں، یا حضورؐ کے دونوں ہاتھوں پر پھونک کر آپؐ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جسم اطہر پر انھیں پھیرتی تھیں"۔(ایضاً، ص ۵۲۱-۸ ۵۳) (جاری)

حواشی

۱؎ جیسے "غبار خاطر" از مولانا ابوالکلام آزاد، جس کا شمار اس صف میں ہوگا۔اس طرح شوکت تھانوی کی "بار خاطر" بھی اسی زمرے میں آتی ہے، جو ایک طرح سے "غبار خاطر" کی پیروڈی ہے۔

۲؎ نیاز فتح پوری صاحب کے خطوط کا ایک خاصا حصہ اسی قبیل کا ہے۔

۳؎ سو سے زیادہ افراد اور واقعات کے بارے میں معلومات جمع کرنا خود ایک کارنامہ ہے۔البتہ ایک جگہ مرتبین سے چوک ہوگئی ہے، محترم چودھری غلام محمد کے نام خط (نمبر ۹۲، ص ۴۰۹) میں کراچی کے جن نقی صاحب کا ذکر ہے اور جن کے سلسلے میں ص ۴۱۳ پر نوٹ دیا گیا ہے، وہ سید نقی علی صاحب نہیں، نقی نواب ہیں جو کراچی کے معروف تاجر ہیں۔جماعت اسلامی کے ابتدائی ارکان میں سے ہیں۔تقسیم ملک کے بعد رکنیت بوجوہ جاری نہ رکھ سکے، لیکن مولانا محترم سے گہرا ذاتی تعلق رہا اور تحریک کی دامے، درمے، سخنے مدد کرتے ہیں۔ایوبی مارشل لا کے زمانے میں مولانا محترم بالعموم نقی نواب صاحب ہی کے گھر نقی ہاؤس میں قیام فرماتے تھے۔